# مستنصر حسین تارڑ کے شمالی پاکستان کے سفرناموں میں مقامی تہذیب وثقافت کی عکاسی

آمنہ فرید


## Abstract:

Mustansar Hussain Tarrar is a renowned Urdu travelogue writer, novelist and columnist. He has introduced Northern Pakistan in rest of the country by writing many travelogues about these areas. This article depicts presentation of different aspects of local culture of Northern Pakistan like consuetude, social behaviour, ethics, social values, beliefs, living style, traditions, architecture, clothing, food, occupations, linguistics and folk literature in his travelogues. This cultural study include his travelogues like Hunza Dastan, Safar Shumal key, Chitral Dastan, Nanga Parbat Baltistan Dastan, K2 Kahani, Yalk Saraye, Snow Lake, Deo Sai, Shamshal Beymisal, Barfili Bulandian, Ratti Gali, Rakaposhi Nagar and Haramosh Naqable Faramosh.


مستنصر حسین تارڑ اردو ادب میں بحیثیت سفرنامہ نگار، ناول نگار اور کالم نویس ممتاز شناخت رکھتے ہیں۔ انہیں پاکستانی شمال کے سب سے زیادہ اردو سفرنامے لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ۱۹۸۴ء سے ۲۰۱۶ء تک کے بتیس برسوں میں وہ متعدد بار شمالی علاقہ جات میں گئے اور اس مدت میں یہاں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو بنظر غائر دیکھا۔ انھوں نے ان علاقوں کو پورے پاکستان میں متعارف کرایا۔ ان کے سفرناموں سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ یہاں پہنچے۔ شمالی علاقہ جات پر مختلف وقتوں میں منظر عام پر آنے والے ان کے سفرناموں میں ہنزہ داستان، سفر شمال کے، چترال داستان، نانگا پربت بلتستان داستان، کے ٹو کہانی، یاک سرائے، سنو لیک، دیوسائی، شمشال بے مثال، برفیلی بلندیاں، رتی گلی، راکاپوشی نگر اور حراموش ناقابل فراموش شامل ہیں۔

سفرناموں میں تہذیب وثقافت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ممالک کی قدیم ثقافت کے متعلق جاننے کا واحد ذریعہ ان کے قدیم دور کے سفرنامے ہیں۔ ثقافت ایک طرز فکر، تخلیقی روایت اور طرز معاشرت کا نام ہے۔ شمالی پاکستان بہت متنوع ثقافت کا حامل خطہ ہے اور تہذیبی شکست وریخت کے عمل سے گزرا

ہے۔ ماضی قریب میں مخصوص جغرافیائی تناظر میں باقی دنیا سے کٹے رہنے کے باعث یہاں پروان چڑھنے والی ثقافت بیرونی اثرات سے محفوظ رہی۔ سڑکوں کی تعمیر اور آمدورفت کے بہتر ذرائع سے اب ان علاقوں کی ثقافت تیزی سے تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ زیر بحث مقالے میں مستنصر حسین تارڑ کے شمالی پاکستان کے سفرناموں کا ثقافتی حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان سفرناموں میں مقامی تہذیب وثقافت کے مختلف پہلوؤں معاشرت، سماجیات، عقائد وایمانیات، فنون لطیفہ، تمدن اور لسانیات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

## ہنزہ داستان (۱۹۸۴ء)

مستنصر حسین تارڑ کا شمال کا پہلا سفرنامہ ''ہنزہ داستان'' ۱۹۸۴ء میں گلگت اور ہنزہ کے سفر کی تفصیلات پر مبنی ہے۔ مصنف نے اس سفرنامے میں ویگن میں موجود مقامی مسافروں، سوست میں آنے والے چینی حاجیوں، ان کی مخصوص خوراک، کوہستانیوں کی خصوصیات، شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے دوران بدھ آثار کی تباہی، ان علاقوں میں بدھ مت کی تاریخ، گلگت کی جغرافیائی اہمیت، ۱۹۸۴ء کے گلگت کی جھلک، ہنزہ کے بارے میں جغرافیائی معلومات، بالائی، مرکزی اور زیریں ہنزہ میں آباد اقوام، لوگوں کی سماجی حالت، ہنزہ اور نگر کا تقابل، مقامی گھروں کا نقشہ، خواتین اور مردوں کا طرز زندگی اور مقامی خوراک وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ویگن میں سوار مقامی کوہستانی نے اپنے علاقے کے بارے میں بتایا کہ کوہستان میں صرف خوف، بھوک، بیماری اور جہالت ہے۔ بھربھری مٹی کے پہاڑ ہیں۔ لوگوں کو باہر کی دنیا کا کچھ پتہ نہیں، باہر والوں پر شک کرتے ہیں۔ ذاتی دشمنیاں اتنی شدید ہیں کہ رات کو جگہ بدل کر سوتے ہیں کہ کوئی سوتے میں وار نہ کر دے۔ پہچان کے ڈر سے چہرے چھپا کر رکھتے ہیں۔[۱]

اس دور کے گلگت کی جھلک دکھاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ تب گلگت میں لوگوں کا محبوب ترین موضوع جہاز کی آمد ہوتا تھا۔ دکاندار جہاز کے آنے کے حساب سے چیزوں کے دام بتاتے تھے۔ گلگت کی تہذیب جدیدیت کے رنگ سے بچی ہوئی تھی۔ یہاں کوئی ٹیلی ویژن نہیں تھا۔ مخلوط قسم کی آبادی تھی۔ گلگت کے ڈرائیور ہنزہ جاتے ہوئے یہاں روزگار کے لیے مقیم لوگوں کی طرف سے بھیجی جانے والی اشیا ان کے عزیز واقارب کو رضاکارانہ طور پر پہنچاتے تھے۔ پسو میں ماضی بعید میں مجرم کو سزا کے طور پر ہل، بیج اور کھیتی باڑی کا سامان دے کر کسی دور کی وادی میں بھیجا جاتا وہ وہاں کھیت بنا کر رہنے لگتا، اس طرح کئی وادیاں آباد ہوئیں۔[۲] ہنزہ میں اشیا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ٹوکریوں میں رکھا جاتا جو نہر پر رکھے شہتیر سے باندھ کر پانی میں ڈبوئی جاتی تھیں۔ وہاں کسی بھی شخص کو سلام کیے بغیر گزرنے کا رواج نہیں تھا۔ خواتین روایتی لباس میں کھیتوں میں مگن تھیں مگر روایتی چوکور ٹوپی صرف عمر رسیدہ خواتین کے سروں پر تھی۔ پہلے ہنزہ کے گھوڑے اور پولو کے کھلاڑی بہت مقبول تھے مگر نئے زمانے کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر سے لوگوں نے پولو کے گھوڑے بیچ کر جیپیں خرید لیں۔ ہنزہ کی خاص چیز ڈاؤڈاؤ سمجھی جاتی ہے جو مقامی سوپ ہے۔ مستنصر نے التر گلیشیر میں سے اہل ہنزہ کے بہت مشقت سے کول نکالنے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ

شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی ٹوکری میں بیٹھتے۔ ان کے ساتھی انھیں یاک کے بالوں سے بنے رسے سے باندھ کر چٹان کی چوٹی سے لٹکا دیتے وہ اسی طرح لٹکے ہوئے مارخور کے سینگوں کے ساتھ چٹانوں کو کرید کرید کر نہریں بناتے تھے۔ بڑے قل سے کئی چھوٹے قل گھروں اور کھیتوں تک پہنچائے جاتے۔ ان کی حفاظت اہل ہنزہ بالکل اپنے گھروں کی طرح کرتے ہیں۔ اپنے بانٹے گئے علاقوں میں وہ قل کی صفائی کرتے ہیں، ریت نکالتے ہیں اور کناروں کی مرمت کرتے ہیں۔[۳۱] ایک مقامی عورت نے قل کے کنارے بنائے گڑھے میں اپنی ہنڈیا کو ڈھانپ کر رکھا تھا تا کہ محفوظ رہے۔

## سفر شمال کے (۱۹۸۶ء)

سوات اور درہ خنجراب کا سفر مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ ۱۹۸۶ء میں کیا جو ''سفر شمال کے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں مصنف نے سوات کی مساجد کو جدید کرنے کے چکر میں قدیم منقش ستون نکال کر سواتی فن کی امریکہ یورپ منتقلی، سوات کی تاریخ، یہاں گندھارا آرٹ کی ترقی، مینگورہ کی وسعت، بت کدہ کے قدیم آثار، والی سوات کی عوام کے دلوں میں محبت، مقامی قبرستان میں لکڑی کے منقش پائے خزی گڑے ہونے، بحرین کے کمرشلزم، کالام کی کوہستانی خطرناکی کی شہرت، سیاحوں کا مانسہرہ کی تعریف نہ کرنا، نلتر کی خوبصورتی، پسو میں لوگوں کے رہن سہن، شمشالیوں کی مشکلات، سیاحت کی ترویج کے لیے مقامی لوگوں کو ہوٹلوں کی تعمیر کی مد میں حکومتی قرضوں کی فراہمی، ہنزہ میں غیر ملکی سیاحوں کو زیادہ اہمیت دینے اور آغا خان کی تاجپوشی کی سالگرہ پر اہتمام کا ذکر کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ بتاتے ہیں کہ پہلے سواتی مساجد میں آٹھ فٹ بلند منقش ستونوں پر چھت ڈالی جاتی تھی اب یہ ستون نکال کر لینٹر کی چھت کا رواج ہو گیا تھا۔ لنڈا کے علاقے میں لوگوں نے قبروں پر اس عقیدے کے تحت پھول اگا رکھے تھے کہ گزرنے والے پھول دیکھ کر رکیں گے اور مرنے والے کے لیے دعا کریں گے۔[۳۲] مینگورہ میں سیاحوں کو گاہک کی بجائے مہمان سمجھا جاتا تھا۔ بت کدہ کا نیا نام گل کدہ رکھا گیا تھا۔ مقامی لوگ بت کدہ کہہ کر راستہ پوچھنے پر برا مناتے تھے۔ سوات میں سیاحوں میں پرانے سامان کی بڑھتی مانگ کے باعث دکاندار دور دراز علاقوں میں پرانے سامان کے بدلے نیا فروخت کر کے کئی سو برس پرانا گھریلو سامان سیاحوں کو منہ مانگے داموں بیچتے تھے۔ میاندم میں ایک گھر میں خواتین شادی کی تیاری کے لیے دیواروں پر بیل بوٹے بنا رہی تھیں۔ مستنصر نے سوات کے اس دلچسپ رواج سے بھی آگاہ کیا ہے کہ بلندی سے آنے والی تمام ویگنیں، جیپیں، گاڑیاں چیڑھ اور دیودار کی ٹہنیوں سے ڈھکی ہوتی ہیں یہ قابل فخر علامت سمجھی جاتی ہے کہ ہم اونچائی پر جنگلوں سے آرہے ہیں۔ نلتر ریسٹ ہاؤس میں نالے پر دیسی بجلی گھر قائم تھا وہاں چوکیدار کا کہنا تھا بجلی زیادہ بلب کم ہیں۔ پسو میں بتورا گلیشیر کے دریا میں آنے والے ٹکڑوں کو چیزیں ٹھنڈی کرنے کے لیے استعمال اور خوراک کے لیے ہاضم مقامی بوٹی چومورو کا بھی ذکر کیا

ہے۔قمریس میں موسم کی شدت سے بچاؤ کے لیے بند ڈربہ نما مکان ساتھ ساتھ جڑے تھے۔ایک مقامی مخصوص ترکستانی طرز کے گھر کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

''نوراماں گوجال کے مخصوص ترکستانی طرز کے گھر میں رہتا تھا۔دو تین دروازوں کے اندر برفیلی ہواؤں سے بچاؤ کے لیے کھڑکیوں اور روشندانوں کے بغیر چوبی ستونوں والا ایک بڑا کمرہ جس کے ایک حصے میں خوراک پکائی جاتی ہے۔ایک حصے میں مہمانوں کو بٹھایا جاتا ہے اور ذرا بلند حصہ سونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''۵

قمریس میں کمرشلزم نہ ہونے کے باعث مہمانداری کی قدیم روایات باقی تھیں۔وہاں کھانے سے پہلے مہمانوں کے ہاتھ دھلانے کا رواج تھا۔

## چترال داستان (۱۹۸۹ء)

چترال داستان ۱۹۸۹ء میں مستنصر حسین تارڑ کے چترال کے اس سفر کا تذکرہ ہے جس کی یاد ان کے ذہن میں تازہ تھی کتابی شکل میں دیر سے پیش کیا۔مستنصر نے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ گلگت سے درہ شیندور عبور کر کے چترال اور کافرستان کا سفر اختیار کیا تھا۔اس سفرنامے میں انھوں نے شاہراہ قراقرم کے کنارے آباد قدیم بستی پتن کے ہزاروں برس پرانے مظاہر فطرت کی پرستش کرنے والوں کے قبرستان، اشکومن اور ہوشے میں مقامی دیومالا، آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے شمالی علاقوں کی اہمیت، تیزی سے جدت کی طرف مائل وادی یاسین کی قدیم و جدید جھلک، وادی پھنڈر کی خوبصورتی، خلطی جھیل کے حادثاتی طور پر وجود میں آنے، چترالی مہمان نوازی، ایک چترالی خاندان کے آبائی قلعے کے قدیم ماحول، چترال اور گلگت کے تقابل، چترال کے شاہی بازار سے ہونے والی مایوسی، چترالیوں کی آرام طلبی، لواری ٹنل کے مسئلے، گرم چشمہ میں موجود افغان آبادکاروں، مقامی آبادی پر بدخشانی اثرات، چترال محل، چترالیوں کے کالاشیوں سے خار کھانے، چترالی ضیافتوں میں مقامی کھانوں کے علاوہ کالاشیوں کے عقائد، سماجی رسوم، شادی بیاہ کے رسوم، ان کے مقامی نام، کالاش کے مقامی گاؤں، مرنے کی رسوم، کالاش خواتین کی مصروف زندگی، ہارسنگھار کے طریقے، کافر عبادت گاہوں، قربان گاہوں، کالاش مذہب میں قربانی اور رقص کی اہمیت اور مقامی تہواروں کا تذکرہ کیا ہے۔

مستنصر پتن نامی قدیم بستی میں مظاہر قدرت کی پرستش کرنے والوں کے دور کے قبرستان کا ذکر کرتے ہیں کہ وہاں اب تک منقش لکڑی کی ڈولیاں قبروں پر رکھنے کا رواج ہے۔۶ امت کے قدیم قبرستان سے چرواہوں کو سونے کے سکے اور نوادرات ملتے رہتے ہیں اس لیے مصنف آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے ان علاقوں کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔اس قبرستان میں ہزاروں سال قبل لوگ اپنے عہد کی نشانیوں کے ساتھ قبروں میں دفن ہوئے۔ کچھ سال قبل ۱۹۸۹ء کے وادی یاسین میں صرف ایک مسجد، مہمان خانہ، قدیم حفاظتی مینار اور چنار تھے۔ چھ سال بعد

وہاں بھاری ٹرک اور بسیں چلتی تھیں۔سپر مارکیٹیں ،جدید طرز تعمیر کے گھر اور ویڈیو گیم کی دکانیں تھیں۔یہ ہنزہ کے ہم پلہ ہو چکی تھی۔یہاں مہمان نوازی کی قدیم روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے مستنصر کا کہنا ہے:

''مجھے ان خطوں کی مہمان نوازی کی یہ روایت بے حد بھلی لگی کہ خاتون خانہ ایک بڑا آفتابہ اٹھائے ایک چلمچی آپ کے آگے رکھتی ہے۔اور آپ کے ہاتھ دھلاتی ہے اور پھر جھک کر طعام کی جانب اشارہ کرتی ہے۔''۷

بِرِنگل گاؤں میں لڑکیوں کے چہروں پر کالاش لڑکیوں کی مانند سرمے سے بنے نقوش تھے۔وہاں سیاہ اور حنائی رنگوں سے چہرے رنگنا قدیم ثقافت کا حصہ ہے۔۸ شینڈور ہٹ کے رکھوالے کے حقارت آمیز رویے کا ذکر مصنف نے کیا ہے۔گلگت کا مقامی جیپ ڈرائیور چترال کو الگ ملک قرار دے رہا تھا۔چترال میں دستور ہے کہ مہمان کے لیے سجائی گئی میز کا کوئی حصہ اگر خالی رہ جائے تو میزبان اپنی بے عزتی سمجھتا ہے۔پھر بھی ان کی میزیں طویل ہوتی ہیں۔چترالی آرام طلب ہیں۔وہاں محنت والے سارے کام افغان اور پٹھان کرتے ہیں۔مصنف کے مطابق چترالی ثقافت پر بیرونی اثرات کم ہیں۔گرم چشمہ میں آباد بدخشانی افغانیوں کے رہن سہن پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ وہ اپنے جھونپڑوں کی دیواروں پر رنگا رنگ کپڑے چسپاں کر کے انھیں خوب صورت بناتے ہیں۔مٹی کے فرش پر بدخشانی قالین بچھاتے ہیں،مقامی آبادی سے میل جول کم رکھتے ہیں۔۹ کالاشیوں کے طرز زندگی،لباس،رسومات،عقائد کا تفصیلی تذکرہ ہے۔کالاشی خواتین زیبائش کے لیے چولہے کی کالک،پرندوں کے پر اور سیپیاں استعمال کرتی ہیں۔ان کے ہار سنگھار کے طریقے قدیم زمانے سے اب تک نہیں بدلے۔وہاں چلم جوشی کے تہوار کی تفصیلات بھی مصنف نے سفر نامے میں شامل کی ہیں۔کالاشیوں کا رقص ورزش کی طرح ہوتا ہے جسے وہ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

## نانگا پربت بلتستان داستان (۱۹۹۰ء)

مستنصر حسین تارڑ کے بلتستان کے تین سفروں پر مشتمل "نانگا پربت بلتستان داستان" ۱۹۸۵ء میں فیری میڈوز،۱۹۸۹ء میں لاتوبو ٹاپ میدان اور ۱۹۹۲ء میں ہوشے،شگر اور دیوسائی تک کے سفر کے احوال پر مبنی ہے۔اس میں مصنف نے مقامی لوگوں کے نانگا پربت پر پریوں کے ہونے کے عقیدے،بلتیوں کے دھیمی طبع ہونے،سکردو کے بارے میں جغرافیائی معلومات،سکردو کالج میں میوزیم،مقامی لوگوں کی سرد موسم کو جھیلنے کے لیے تیاری،کچورا جھیل،مقامی بلتی شاعروں ادیبوں،بلتی خانقاہوں کے طرز تعمیر،صدپارہ کی حفاظتی دیوار اور قدیم ڈیم،بلتیوں کے پھولوں کے شائق ہونے،چقچن مسجد کی تاریخ،چپلو کی مقامی خوراک،دریا پار کرنے کے لیے پھولے مشکیزوں سے بنی کشتی انڈس رافٹ،شیعہ اور سنی مسلک کے لوگوں کے لیے ایک ہی مسجد کی موجودگی،اہل بلتستان کی مذہبی رواداری، کھرپوچے قلعے کی تاریخ،بلتی زبان ولوک ادب،جرائم کی کم شرح،تاتو گاؤں کی ثقافت و تاریخ،پورٹروں کے

روپے، فیری میڈو کی تاریخ، کوہستانیوں کے خشک رویے، ترشنگ اور چورت والوں کی چپقلش، روپل گاؤں کے لوگوں کے رہن سہن، پورٹروں کی مشکلات، مقامی گھروں کے طرزِ تعمیر، اہل ہوشے کی سادہ لوحی، ان کے رہن سہن ،موسم اور قدامت، شگر کی خانقاہ اور گلتری کے خانہ بدوشوں کے دیوسائی عبور کرنے سے متعلق آگاہ کیا ہے۔

مستنصر دیوسائی کی برفیں پگھلنے کی دلچسپ روایت کا ذکر کرتے ہیں کہ صدیوں سے بکروال اپنے جانوروں کے ساتھ ادھر آتے ہیں اور برف پگھلنے کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ جب وہ جھیل صدپارہ کے قریب سے اتر کر سکردو پہنچتے ہیں تو لوگ دیوسائی کی برفوں کے پگھلنے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اکثر بلتی گائیڈ، پورٹر اور باورچی کا کام کرتے ہیں۔ خپلو کی ویگن میں سوار ایک مقامی بوڑھی خاتون کے حلیے کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ وہ روایتی چوغے میں ملبوس تھی۔ اس کے کندھوں پر درجنوں مینڈھیاں لٹکتی تھیں۔ وہ چاندی کا زیور اور بھاری جھمکے پہنے ہوئے تھی۔[۱۰] کھیتوں میں کام کرتے اکثر بلتیوں کے کانوں یا ٹوپیوں پر پھول لگے تھے۔ وہاں گلیشیر کے پانیوں کو چھوٹی نہروں میں تقسیم کر کے گھریلو اور زرعی ضروریات کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اہل خپلو کی مہمانوں کو پیش کردہ خصوصی خوراک میں ابلے چاول، گوشت اور مقامی ساگ شامل ہے۔ اخروٹ سے بننے والے خصوصی کھانے پراپو کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان علاقوں میں دہی کو لسی کہا جاتا ہے۔ روپل میں لکڑی کے ہموار چھتوں والے مکان آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ ان کے برآمدوں میں سبزیوں کو سکھانے کے لیے ہاروں کی طرح گوندھ کر لٹکایا گیا تھا۔ یہاں چھلی نما درخت کو مقامی چرواہے جلا کر سردیوں کے لیے کوئلہ بناتے ہیں۔ ایک پورٹر کو جب رقم کی ادائیگی کی گئی تو اسے حساب کا نہیں پتہ تھا۔ اس کے بارے میں مصف کا کہنا ہے:

> ''...... مجھے معلوم تھا کہ بابا یہ رقم جوں کی توں اپنے بیٹے کو دے گا کیونکہ اس کے پاس اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ وہ بوٹوں کے اس جوڑے سے بھی مطمئن تھا جس پر چمڑے کے بڑے بڑے پیوند کسی مقامی موچی نے تھوپ رکھے تھے اور دونوں بوٹ بھی الگ الگ تھے۔ ان میں تسمے نہ تھے بلکہ انھیں رسیوں اور چیتھڑوں سے کسا گیا تھا۔''[۱۱]

اہل ہوشے کی قدامت کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ وہ قدیم وضع کی بلتی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ ان کے چہرے دھوئیں کے باعث سیاہ تھے۔ گرمیاں مختصر ہوں تو ان کی گندم نہیں پکتی۔ وہ خوفزدہ لوگ ہیں۔ ان کے لباس میوزیم میں رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک مقامی خاتون نے مصنف کی بیوی سے کہا:

> ''میرا رنگ بھی تمھارے جیسا ہے۔ میرے پاس بھی صابن ہوتا تو میں بھی منہ ہاتھ دھوتی۔ نیچے سے آئی ہو؟ سنا ہے سکردو بہت بڑا شہر ہے۔ نہیں میں تو کبھی ہوشے سے نیچے نہیں گئی۔ ہاں اوپر جاتی ہوں گھاس کاٹنے کے لیے۔''[۱۲]

## کے ٹو کہانی (۱۹۹۳)

کنکورڈیا تک کا یہ سفر مستنصر حسین تارڑ کا کسی باقاعدہ ٹیم کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ اس سفرنامے میں بلتیوں کے مزاج بلتستان کے موسم، شگر اور سکردو سے پورٹروں کی تقسیم کے قواعد، حشوپی میں مقامی لوگوں کے عام پتھروں کو قیمتی کہہ کر بیچنے، تھنگل میں گلہر کے ایک مریض کا اپنے گلہڑ کے بڑے ہونے پر فخر، آخری آباد گاؤں اسکولے کے رہن سہن، بلتی پورٹروں کے غیر دوستانہ رویے، ایک جگہ دریا پر پل پار کرنے پر ٹیکس، کنکورڈیا ٹریک کی مشہور کیمپنگ سائٹس، ماحولیاتی آلودگی، پورٹروں کے طرز زندگی، مستاگ گلیشیر کے قریب شاراگن نامی قدیم گاؤں کے کھنڈرات کی دریافت اور کنکورڈیا میں موجود اہم پہاڑوں کے بارے میں جغرافیائی و تاریخی معلومات شامل ہیں۔ سکردو ائیر پورٹ کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ یہاں بلتیوں کی پسند ناپسند کی ہر شے آسمان سے اترتی ہے۔ جہاز سے زندگی کی آسائشوں کے کریٹ نکلتے ہیں۔ فوجی افسر، مولوی اور جھگڑے آتے ہیں۔[۱۳] سکردو میں رواج ہے کہ میدانی علاقوں سے آنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ نیچے سے آیا ہے اور کوئی پہاڑوں میں جائے تو کہتے ہیں اوپر گیا ہے۔ صد پارہ جھیل کے پاس دیوسائی کی برفیں پگھلنے پر آنے والے خانہ بدوشوں کی وہاں عدم موجودگی پر مصنف نے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ کہیں ان پر پابندی تو نہیں لگا دی گئی۔ مقامی پورٹروں کے سونے کے بارے میں مستنصر بتاتے ہیں: ''انھیں ہماری طرح آرامدہ سلیپنگ بیگز اور خیموں کی ضرورت نہ تھی۔ ان میں سے بیشتر پتھروں کی دیوار سے ٹیک لگائے سو رہے تھے۔''[۱۴]

اسکولے کے بارے میں مصنف بتاتے ہیں کہ پتھروں اور برف کے ویرانے سے ادھر آخری بستی ہے۔ وہاں اگنے والی خاص نسل کی گندم کے کھیت گلابی رنگ کے تھے۔ جس کا مقامی نام گیاؤس ہے۔ اسکولے ہموار چھتوں کا کچا پتھریلا گاؤں تھا۔ چھتوں پر شہتوت کی شاخوں سے بنے چھوٹے مستطیل کمرے تھے۔ یہ برساتی نما چھجے گرمیوں میں چھت پر سونے اور خوراک ذخیرہ کرنے کے کام آتے ہیں۔ اہل سکردو کے لباس عجیب تھے۔ عورتیں گھروں میں کھڈیوں پر تیار کردہ اونی چوغوں میں ملبوس تھیں جن پر قدیم طرز کی شوخ کڑھائی تھی۔ رنگین ٹوپیوں میں عورتوں کے بال منکوں اور سیپیوں میں گندھے مینڈھیوں کی صورت شانوں پر پڑے تھے۔ ان کے چہرے سرمے اور مہندی کے بیل بوٹوں سے سجے تھے۔[۱۵] اسکولے میں چوری کا رواج نہیں۔ پائیو میں پورٹروں میں راشن تقسیم کیا جاتا ہے وہ وہاں اکٹھی روٹیاں پکاتے جو گلیشیر پر نمکین چائے کے ساتھ کھاتے۔ ایک پورٹر مصنف کی ٹیم میں صرف اس لیے شامل ہوا تھا کہ اس آمدنی سے مہم سے واپسی پر اپنے لیے تیسری بیوی خرید سکے۔

## یاک سرائے (۱۹۹۵ء)

مستنصر حسین تارڑ کا یہ سفرنامہ ۱۹۹۵ء کے جھیل کرومبر اور وادی بروغل کے سفر کی روداد ہے۔ یاک سرائے میں مصنف نے مقامی ثقافت کے جن مظاہر کا تذکرہ کیا ہے ان میں بشام سے شانگلہ پاس کو اٹھتی سڑک عاشق روڈ کے نام کی وجہ تسمیہ، چلاس کی بدھ عہد کی چٹانوں پر کندہ قدیم نقوش، فیری میڈوز تک کے قدیم راستے اور اب سڑک کی موجودگی، گلگت کی بڑھتی رونق، اہل ہنزہ کی خصوصیات، سوختر آباد میں ازبک آبادی، وادی اشکومن میں متوقع ازبکستان روڈ بننے پر گرمجوشی، اشکومن کے پانچ بڑے تہوار، پورٹروں کے ہمدرد رویے، شکاری کینجا بائی کی جرات، مہمانوں کو دبانے کے کوہستانی روایت، گوجروں کی مہمان نوازی، سوختر آباد میں شکاریوں کے واقعات، وہاں کے لوگوں کے واخان پار ازبکستان سے تعلقات اور آمدورفت، درہ درکوت کی تاریخ اہم ہیں۔

واخان پامیر ٹریک کے بارے میں مصنف نے بتایا ہے کہ سویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے حساس علاقہ ہونے کے باعث وہاں جانا ممنوع تھا۔ اشرف امان نے اسے کوہ نوردوں سے آباد کیا۔ اشکومن کے پانچ بڑے تہواروں کا ذکر کیا ہے۔ بیج بونے کا تہوار بی تہوار، گندم کی بالیاں کاٹ کر لا کر گھروں کے باہر لٹکانے کا رواج نیسو گوٹ ہے۔ بلند چراگاہوں کی طرف جانے کا تہوار نیلو وایوگ اور وہاں سے واپس آنے کا تہوار نیلٹ یوجوک ہے۔ گوشت محفوظ کرنے کا تہوار نسالو ہے۔[۱۶] مصنف کی ٹیم میں شامل اکثر پورٹر بہت ہمدرد ثابت ہوئے۔ ان میں سے چند پھٹی پرانی جوتیوں میں یہ مشکل سفر کر رہے تھے۔ وادی سوئنج میں رات کو جنوں کو بھگانے کے لیے پورٹر ڈرم اور برتن بجاتے رہے تھے۔ ان علاقوں میں کسی بھی شخص کے لیے سب سے بڑی خوش بختی ایک گھوڑے کا مالک ہونا ہے۔ اس کے لیے وہ ساری زندگی مشقت کرتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی ہمیشہ سے تاجکستان کی طرف آمدورفت ہوتی رہی ہے، وہ کرنسی کی بجائے لین دین سے چیزیں لیتے۔[۱۷]

## سنولیک (۱۹۹۶ء)

سنولیک مستنصر حسین تارڑ کے ۱۹۹۶ء میں دنیا کے طویل ترین برفانی راستے بیافو ہسپر پر سفر کی روداد ہے۔ اس میں انھوں نے زمانہ قدیم میں نگر والوں کی اہل اسکولے کو لوٹنے کے لیے اس برفانی گزرگاہ پر سفر کی روایت، پورٹروں اور گائیڈ کا رویہ، شمالی علاقوں کی روڈ بلاک کے باوجود ٹرانسپورٹ حکمت عملی، بے تحاشا ہاتھ ہلا کر خطرے سے خبردار کرنے کا طریقہ، اسکولے کی قدامت پر جدید دور کے اثرات، بلتی پورٹر کی خصوصیات، سنولیک سے دیگر راستوں اور چوٹیوں کے بارے میں جغرافیائی معلومات، ہسپر گاؤں، ہسپر کی مقامی خوراک اور ہنزہ کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ مستنصر نے سیاحوں کو لوٹنے کے حوالے سے بتایا ہے کہ داسو کے قریب حیدرآباد نامی گاؤں میں ایک دکان پر فٹ

پاتھ پر بیس تیس روپے میں بکنے والی عام سی عینک کی قیمت دکاندار نے پانچ سو روپے بتائی۔۱۸؎ بلتی پورٹر خیمہ نصب کرنا اپنے لیے چیلنج سمجھتے ہیں۔اسکولے کے تھانیدار کا کہنا تھا کہ یہاں لوگ جرائم نہیں کرتے اس لیے ادھر ڈیوٹی پر آنا انھیں عذاب لگتا ہے۔ اسکولے کی دستکاریوں کے برائے فروخت نمونوں کو مستنصر نے معدوم ہوتی تہذیب کی ہنر مندی قرار دیا ہے۔اسکولے کے حاجی مہدی کا کہنا تھا کہ اب لوگوں کو ضروریات زندگی کی عادت ہو گئی ہے اس لیے سڑک بلاک ہونے کے باعث چینی گھی وغیرہ نہ پہنچ سکنے سے بہت مشکل ہوتی ہے۔اب ان کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔اسکولے کی تبدلی کا ذکر حاجی مہدی کی زبانی مصنف نے اس طرح کیا ہے:

''میری نظروں کے سامنے بدل رہا ہے۔آپ ادھر تیس برس پہلے آتے تو دیکھتے اسکولے کیا ہے۔ آپ جانتے ہو ادھر گاؤں میں چھ کنال کا رقبہ ایسا تھا جو صرف اس ہرکارے کے لیے مخصوص تھا جو سکردو کے راجہ کا پیغام لے کر چین جاتا تھا۔مستاگ ٹاور کے درے کو عبور کر کے۔اور یہ رقبہ اب بھی اس ہرکارے کی اولاد کی ملکیت ہے۔ ہمارا قدرتی رابطہ ادھر تھا چین اور تبت کے ساتھ۔ پاکستان بننے کے بعد ادھر ہو گیا ہے پنجاب کے ساتھ۔''۱۹؎

اسکولے میں ہر مہم میں شامل پورٹروں کے لیے بکرا خریدنے کی روایت ہے۔گائیڈ نے بکرے اور اس کے حصے کے روپے فی پورٹر لینے میں فرق بتاتے ہوئے کہا کہ روپے اور بکرے میں فرق ہوتا ہے۔روپیہ بیوی کھائے گا جبکہ بکرا تو پورٹر خود کھاتا ہے۔پورٹروں سے کسی خوشنما منظر تک جانے کی بات کی جاتی تو وہ کہتے بیکار پتھر اور پھول ہے انھیں دیکھ کر کیا کریں گے۔پورٹروں کی پسندیدہ پڑاؤ کی جگہ وہ ہوتی ہے جہاں شدید موسم سے بچاؤ ممکن ہو۔وہ کبھی کچن ٹینٹ میں پناہ لیتے ہیں،کبھی برف پر لکڑیاں جلا کر،کبھی دریا کی ریت پر لیٹ کر اور کبھی کسی چٹانی کھو میں رات بسر کرتے ہیں۔ بیت مارو گلیشیر کے کنارے پڑاؤ میں ندی سوکھنے سے پانی نہیں تھا تو پورٹر عباس نے زمین کے ساتھ کان لگا کر پانی بہنے کی آواز سنی اور اپنی انگلیوں سے زمین کھودی تو پانی نکل آیا۔ہسپر میں مقامی افراد کے لیے کوہ نوردوں کو دیکھنا تفریح تھی۔ہسپر کی مقامی خوراک چھپ شورو کا مصنف نے بتایا ہے کہ میدے کے اندر مرغی کو دم پخت کر کے بنائی جاتی ہے۔ہسپر کی قدیم چوبی مسجد نے گمنام اور سادہ ہونے کے باوجود مصنف کو بہت متاثر کیا۔ اس میں قدیم نسخوں والے کتابت شدہ قرآن پاک، خطاطی کے نمونے، کربلا کی خاک کی ٹھیکریاں اور مارخور کی کھالیں تھیں۔۲۰؎

## دیوسائی (۱۹۹۷ء)

مستنصر حسین تارڑ نے دیوسائی اور برجی لاء کا یہ سفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۱۹۹۷ء میں کیا۔اس سفرنامے میں مصنف نے دیوسائی کے راستوں کی جغرافیائی معلومات، لینڈ سلائیڈنگ سے سکردو کے اطراف کے راستے بند ہونے، دیوسائی کے مقامی حیوانات اور پرندوں، پورٹروں کی بغاوت، دیوسائی کے غیر متوقع موسم، برجی

لا سے کیٹو، براڈ پیک، گشابرم، مشابرم، چوغولیزا اور نانگا پربت کے نظر آنے، مختلف مقامات کے مقامی ناموں، مچھلی کے شکار کے طریقوں، بکروالوں کے طرزِ زندگی، ریچھوں کے تحفظ کے حوالے سے جنگلی حیات والوں کے اقدامات، ریچھوں کے بارے میں تفصیلی معلومات اور استور اور سکردو کی چپقلش کا تذکرہ کیا ہے۔

معروف کوہ پیما نذیر صابر کی زبانی مصنف نے بلتی پورٹروں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ خون دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہیں اس لیے انھوں نے حادثے کا شکار ہونے والے جاپانی کوہ پیماؤں کی مدد نہیں کی۔[۱۲] ایک بلتی سے ملاقات کا ذکر بھی مصنف نے کیا ہے جو پہلے قصائی تھا پھر پورٹر ہو گیا اب سکردو بازار میں مہنگے داموں سیکنڈ ہینڈ اشیا بیچتا تھا۔ دیوسائی ٹاپ پر پہنچ کر مصنف کی ٹیم میں شامل ایک پورٹر نے ہوٹل کھولا اور فی انڈہ دس روپے اور فی چائے کا کپ بھی دس روپے طلب کیے کیونکہ وہاں تک چیزیں پہنچانا بہت دقت طلب تھا۔ شتونگ میں مچھلی کے شکار پر پابندی کے باوجود مقامی لوگ چھپ کر نالے میں کسی تنگ جگہ کپڑا ڈال کر مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ان علاقوں میں امداد باہمی کا اصول رائج ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ مصیبت میں کون گرفتار ہے یہ جانے بغیر مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس راستے پر صدیوں سے سفر کرنے والے بکروالوں کے بارے میں مستنصر نے بتایا ہے کہ ان کا سفر جہلم سے شروع ہو کر مظفر آباد، کیل، منی مرگ، دیوسائی اور سکردو تک ہے۔ بڑا پانی کا لکڑی کا پل ہر سال تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس کی لکڑی سردیوں میں چلم چوکی اور صدپارہ کے گھروں میں جلتی ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق دیوسائی میں قدیم بستیاں آباد تھیں جو اجڑ گئیں۔ لیکن مصنف نے اس امکان کو رد کیا ہے کہ یہ صرف روایتیں ہیں ان کے باقاعدہ کوئی آثار نہ تھے۔ یہاں لوگ نایاب سنہری عقاب کا غیر قانونی شکار کر کے باہر کے ملکوں میں سمگل کرتے ہیں۔ اہلِ استور اور سکردو کا ہمیشہ آپس میں جھگڑا رہتا ہے کیونکہ پہلے لوگ سری نگر کشمیر سے استور میں اترتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد جہاز سکردو میں اترنے سے اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ ان علاقوں میں قدیم کہاوت ہے جس کی قسمت بری ہو وہ دیوسائی پر جاتا ہے۔

## شمشال بے مثال (۱۹۹۹ء)

چین کی سرحد کے قریب واقع شمشال کا یہ سفر مستنصر حسین تارڑ نے ۱۹۹۹ء میں کیا۔ اس میں انھوں نے شمشال کی قدامت کی تاریخ، یہاں قدیم آبادکاری کی روایت، قدیم و جدید گلگت کا فرق، روپل ہوٹل میں پیش کردہ چلاسی اور ہنزہ کے روایتی رقص، راکاپوشی ویو پوائنٹ کی پہلے وقتوں میں ویرانی اور اب سیاحوں کے ہجوم، جنگ آزادی کے مختلف ہیروز کے کارناموں، ہندی کے قصبے میں ایک بوڑھی عورت کے ستر برس سے ایمانداری سے شہتوتوں کا عرق کشید کرنے، شمشالیوں کی چراگاہوں، راستے میں شمشالیوں کے سٹورز اور ڈریسنگ روموں، اہلِ شمشال کی مختلف قدیم سرائے، قدیم دور کے راستے، شمشالیوں کے نوجوانی کے قصوں میں جانوروں کے عمل دخل زیادہ ہونے، شمشال کے گاؤں، رجب شاہ کے گھر کے اندرون، شمشالیوں کا گرمجوش استقبال، شمشالیوں کے

لیے چراگاہوں کی اہمیت، شمشالی طالب علموں کی تعلیم کے لیے دلچسپی، بستی میں ایک میت کے بعد ہونے والے سوگ اور اس کی رسومات، شمشال کی آبادی، پیشوں کے بارے میں معلومات، شمشالیوں کے رہن سہن اور ایک قدیم عجائب گھر کا تذکرہ کیا ہے۔

مستنصر کا شمشال کی قدامت کے حوالے سے کہنا ہے کہ ہنزہ کے میر اپنے مجرموں کو شمشال کی سزا دیتے تھے یہ ان کا کالا پانی تھا۔ شمالی علاقہ جات میں رقص کی داد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ نوٹ لہراتے ہوئے اٹھا جائے اور رقاص کے گرد چکر کاٹ کر نوٹ اس کی ٹوپی میں اڑس دیں۔ سلطان آباد میں ایک مقامی شخص رحیم بیگ کے دادا نے پوری پہاڑی پانچ سو روپے میں خریدی تھی۔ ہندی کے قصبے میں ایک بڑھیا میلی کچیلی ٹوپی اوڑھے مینڈھیاں سر پر بکھیرے شہتوت کا عرق کشید کر رہی تھی۔ اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مصنف کہتے ہیں:

> ''یہ بڑھیا ہمارے رہن سہن کے کڑے اصولوں سے الگ تھلگ، ان قراقرمی بلندیوں پر ان سے بے خبر ایک ہی، ہمارے لیے ایک گنہگار، ایک اپنی قدیم روایت کی پیروی کرتی تھی۔ ایک قدرتی عمل کی نگہبانی کرتی تھی۔ اور اسے اسی طرح سرانجام دیتی تھی۔ کسی بھی احساس جرم کے بغیر، جیسے ہم سب سکنجبین بناتے ہیں۔ جیسے ہم عرق گلاب یا عرق گاؤزبان بناتے ہیں۔ ویسے وہ شہتوت کا عرق بناتی تھی۔'' ۲۲

شمشال کے راستے میں مختلف مقامات پر شمشالیوں کے سٹور روم تھے جن میں ان کا سامان ذخیرہ تھا۔ وہ آتے وقت اپنے تالے کھول کر مناسب لباس پہنتے اور فالتو سامان ذخیرہ کر کے گلگت چلے جاتے۔ وہاں ایک دکان میں مسافروں کو مفت چائے پلائی جاتی تھی جو شمشالیوں کے مشترکہ فنڈ سے چلتی تھی۔ ۲۳ پہلے اہل شمشال صرف سردیوں میں نیچے آتے تھے جب دریا کا بہاؤ کم ہوتا تھا۔ سردیوں میں وہاں کوئی فصل نہیں ہوتی تھی اس لیے ضروریات زندگی کے لیے نیچے آنا پڑتا تھا پہلے وقتوں میں شمشالی ہنزہ کے میروں کے غلام تھے، ان کے لیے نمک ڈھوتے اور بیگار کرتے تھے اب اپنے لیے محنت کرتے تھے۔ شمشال میں سکول کے لیے لیٹ ہونے والی بچی کا قومی ترانے کے احترام میں رکنا اور کسان کا بھی بیلچہ اٹھا کر سیدھا کھڑا ہونا مصنف کو بہت بھایا۔ انھوں نے واخی ادب کی ایک معروف صنف بلبلیک کا ذکر کیا ہے جو صرف خواتین گاتی ہیں۔ اس میں بلند چراگاہوں میں موسم گرما کے دوران جنم لینے والے جذبات و تجربات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہاں صدیوں پرانے مکان کو عجائب گھر کی شکل دی گئی تھی۔ اس میں موجود قدیم اشیا کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہاں انسانی تہذیب اپنے محدود دائرے میں مکمل تھی۔ اتنے الگ تھلگ اور دور افتادہ ہونے کے باوجود شمشالی اعلیٰ تمدن کے امین تھے۔

## برفیلی بلندیاں (۲۰۰۱ء)

اس سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ کے دو سفر شامل ہیں۔ پہلا ۲۰۰۰ء میں فیری میڈوز اور نلتر پکھورا ٹریک کا، دوسرا ۲۰۰۱ء میں ہوشے سے درہ گوندو گورو کے بیس کیمپ تک کا۔ اس سفر نامے میں انھوں نے ایک شمشالی دعوت میں تلوار کیساتھ رقص کے مظاہرے، داسو پل پر چینی شیروں کے مجسموں کو بت سمجھ کر توڑے جانے، فیری میڈوز کے تبدیلی کی زد پر ہونے، بیال کیمپ کے کمرشلزم، قدیم وجدید نلتر کے فرق، پورٹروں کے فرقہ وارانہ تعصب کا شکار ہونے، ہوشے کے راستے میں کینداس تھنگ نامی مقام پر کاندے کے سیلاب زدہ لوگوں کے عارضی بستی بسانے اور ڈرائیور کے ان تک رضا کارانہ پانی پہنچانے، چلاس کے لوگوں کی باہر والوں کے لیے ناپسندیدگی، چلاس پولیس کے ہمدردرویے، کنکورڈیا کے لیے واپسی کے نئے راستے کی دریافت، پرانے اور نئے خپلو میں فرق کی جھلک، تلس میں ہر طرف پھولوں کی زیاتی، ہوشے کی تبدیلی اور پورٹروں کی خوشی کے اظہار کی بابت بتایا ہے۔ ہنزہ کے ایک گھر میں قدیم خاندانی تلوار کو اجنبیوں کا دیکھنا براشگون سمجھا جاتا تھا۔ فیری میڈوز اور بیال کیمپ میں اب ہر جگہ ہجوم تھا۔ تعمیرات کی بھرمار نے قدرتی حسن کو مجروح کیا تھا۔ پورٹروں نے سرکاری ریٹ کے مطابق معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ان کی مرضی کے دام نہیں دینے تو ان کے علاقوں سے چلے جائیں۔ شمال کے لوگوں کے اس جذباتی رویے کی توجیہ پیش کرتے ہوئے مستنصر کا کہنا ہے کہ یہ دل کے کھرے ہیں، وقتی ابال آتا ہے پھر پرسکون ہو جاتے ہیں۔ ان کی محرومیاں اور مایوسیاں بہت ہیں۔ نامہربان موسموں کے ستائے یہ لوگ پورا سال ان مہینوں کے منتظر رہتے ہیں جب سیاحوں کے آنے پر روزگار کی صورت نکلے اس لیے وہ ذرا جوشیلے اور بے احتیاط ہو جاتے ہیں۔[۲۴] مصنف نے گوجروں کو قابل بھروسہ اور وضع دار قرار دیا ہے۔ پورٹر اور گائیڈ راستوں کی خوبصورتی پر توجہ نہیں دیتے ان کے لیے وہ محض مسافت ہوتی ہے۔ پکھورا میں انسانی ہاتھوں کی بنی برفانی قل تھی جس سے مقامی افراد ریت نکال کر صاف کر رہے تھے۔

پرانے خپلو کی جھلک دکھاتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے کہ رات کو نالے کا پانی سڑک پر آنے سے بازار اور ریسٹ ہاؤس کا رابطہ منقطع ہو جاتا تھا۔ اب دکانوں کی کثرت تھی، ٹریفک کا ہجوم تھا۔ پہلے زوہ کی کھالوں کو مشکیزے کی طرح پانی سے بھر کر پھیلا کر باندھ کر تیار ہونے والی کشتی انڈس رافٹ استعمال ہوتی تھی۔ اب دریائے شیوک پر پل بن جانے سے اس کشتی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ خپلو کے مسلمانوں کی بے حد مسرت کی وجہ مصنف کو سمجھ نہیں آئی۔ بلتی اصل پھولوں اور خوشبوؤں کے بہت دلدادہ ہیں۔ شمالی علاقوں میں پورٹر کے حوالے سے شناختی کارڈ کی کاپی ایک گارنٹی سمجھی جاتی ہے کہ یہ شخص مقامی اور اصلی ہے۔ شمالی جیپ میں گنجائش سے زیادہ سواریوں کو بٹھانے کے حوالے سے اس کی خصوصیات بتاتے ہوئے مستنصر کہتے ہیں کہ اگر ڈرائیور کی مرضی ہو تو ایک چھوٹے موٹے گاؤں کا کل سامان اور باشندے آسانی سے سما جاتے ہیں۔ ہوشے میں ایک جگہ بورڈ پر ہدایت درج تھی کہ ان کے بچوں کو

سویٹس دے کر ٹر خانے کی بجائے کاپیاں اور پنسلیں تحفتاً دیں تا کہ وہ پڑھ لکھ سکیں۔ شائی چو میں پورٹر خود خستہ حالی کے باوجود دوسرے عمدہ رقص کرنے والے پورٹروں پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے حالانکہ ان سے وہ اپنے لیے گرم کپڑے یا جوتے حاصل کر سکتے تھے۔ کچھ پورٹروں کے بے دید رویے کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے:

"۔۔۔مجموعی طور پر کاندے کے پورٹر زیادہ سادہ اور ہمدرد تھے جبکہ ہوشے سے جتنے بھی پورٹر بھرتی کیے گئے وہ قدرے لاپرواہ اور بیگانے تھے۔کوہ نوردوں کی بے پناہ آمدن نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔" ۲۵

ہسپاں کی خیمہ گاہ میں آلودگی اور مقامی لوگوں کے راستوں کے تعین کے لیے پتھروں کے مینار "بتی" کا بھی مصنف نے تذکرہ کیا ہے۔

## رتی گلی (۲۰۰۳ء)

اس سفر نامے میں مستنصر حسین تارڑ کے ۱۹۵۶ء میں کالج کی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ رتی گلی چوٹی سر کرنے، ۱۹۶۳ء میں کاغان کے سفر اور ۲۰۰۳ء میں رتی گلی جھیل کی جانب ایک اور سفر کی روداد شامل ہے۔اس سفر نامے میں انھوں نے قدیم کاغان ناران کے سناٹے، دریائے کنہار میں ٹراؤٹ کی فراوانی، بوڑاوائی کے قدیم ڈاک بنگلے، مقامی لوگوں کے ان کی خاکی پتلونوں کے باعث فوجی سمجھ کر ڈرنے، گوجر خانہ بدوشوں کے اعتقاد اور مہمان نوازی، ۲۰۰۳ء میں قدیم وجدید ناران کا تقابل اور بڑھتے کمرشلزم پر تاسف، جھیل سیف الملوک کی بے حرمتی، اب دریائے کنہار کے ٹراؤٹ سے خالی ہونے، نئی سڑکوں کی تعمیر، گھوڑوں پر سفر، رتی گلی چوٹی سے کسی مقامی بارات کے اترنے اور کاغان کے مٹروں کی فصل کا ذکر کیا ہے۔

۱۹۵۶ء میں ناران کاغان کے مقامی دیہاتیوں کی فوج سے ڈرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے انڈے مرغیاں وغیرہ زبردستی قیمتاً خرید کر لے جاتے تھے۔مگر تب ان کے لیے وہ کرنسی نوٹ بیکار تھے۔۲۶ مصنف کے کالج کی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ شامل انسٹرکٹر نے ایک جگہ گوجروں کو کسی پیر بابا کی زیارت کے لیے جانے کا کہہ کر ان کی ہمدردیاں حاصل کیں اور رات گزارنے کی جگہ اور کھانے کے لیے بھنا بکرا حاصل کیا۔۲۰۰۳ء میں بالاکوٹ میں کاٹھ کباڑ سے نئی تخلیق ہونے والی جیپوں کے بارے میں مصنف کہتے ہیں کہ چینی جاپانی بھی ایسی شاہکار جیپیں تخلیق نہیں کر سکتے جیسے مقامی لوگ کرتے ہیں۔۲۷ ناران کے کمرشلزم پر مصنف نے دکھ کا اظہار کیا ہے۔جھیل سیف الملوک کے بارے میں بھی ان کا کہنا ہے کہ مقامی سرمایہ داروں نے دولت کے لالچ میں برباد کر دیا ہے۔سوچ نامی گاؤں میں شدید برف پڑنے سے لوگ سردیوں میں گھروں کے اندر سے ہی راستے بنا کر ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں۔دودی پت سر جھیل کے آگے کا سفر مصنف اور ان کے ساتھیوں نے گھوڑوں پر بیٹھ کر کیا۔گھوڑوں کے رکھوالوں نے انھیں درہ سرال بہت احتیاط سے پار کرایا۔وادی کاغان میں متروک شدہ جیپ روڈ کی بابت مصنف

نے بتایا ہے کہ وہ مٹروں کو کاغان سے باقی ملک تک پہنچانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ جس موسم میں پورے پاکستان میں کہیں مٹر میسر نہیں ہوتے کاغان کے مٹر مہنگے داموں ملکی منڈیوں میں فروخت ہوتے ہیں۔

## راکاپوشی نگر (۲۰۱۳ء)

یہ سفرنامہ مستنصر حسین تارڑ کے ۲۰۱۳ء میں راکاپوشی کے بیس کیمپ اور نگر کے سفر کی روداد ہے۔ اس میں انھوں نے دیامیر میں غیر ملکیوں کے قتل کے بعد سیکیورٹی کی تشویشناک صورتحال کے باعث ہر جگہ چیکنگ، رائے کوٹ پل سے فیری میڈوز کی طرف جانے والے سیاحوں کے ہجوم، نگر اور ہنزہ کے تقابل، اہل نگر کے پسماندہ رہنے کی وجوہات، دیران ریسٹ ہاؤس کے قیام کے پس منظر، وہاں پیش کیے جانے والے قدیم ثقافتی ذائقوں کے کھانے، مقامی لوگوں کی نگر کی ترقی کی خواہش، قدیم ہنزہ کی جھلک اور ایگلز نیسٹ کی تعمیر کی کہانی کے متعلق بتایا ہے۔

نگر کی پسماندگی کی وجوہات بتاتے ہوئے مستنصر کا کہنا ہے کہ اہل نگر نے شاہراہ قراقرم کے اپنے علاقے سے گزرنے کی مخالفت کی کہ اس سے ان کے گھروں کی بے پردگی ہوگی، ملکی وغیر ملکی سیاحوں کی آمد سے ان کے علاقے میں فحاشی کو فروغ ہوگا۔ اس لیے شاہراہ قراقرم کو قدرتی راستے سے ہٹ کر ہنزہ سے گزارا گیا۔ اس لیے نگر اقتصادی ترقی، جدید سہولتوں اور سیاحوں کی منافع بخش تجارت سے محروم رہ گیا۔ ہنزہ اور نگر کے درمیان قدیم عداوت اب بھی باقی ہے۔ مصنف کے خیال میں اسی عداوت کے باعث مشہور کر دیا گیا کہ نگر کے لوگ غصیلے، کھردرے اور پسماندہ ہیں۔۲۸ جبکہ یہ تاثر غلط ہے۔ اب نگر کے لوگوں میں مصنف نے واضح تبدیلی دیکھی کہ وہ ترقی کے خواہشمند تھے۔ دیران ریسٹ ہاؤس میں پیش کیے جانے والے کھانوں کے بارے میں مستنصر کہتے ہیں کہ اتنے قدیم ثقافتی ذائقوں والے کھانے انھوں نے سارے شمال میں نہیں کھائے۔۲۹ اٹھائیس برس پہلے کے ہنزہ کی جھلک دکھاتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ تب پتھریلے مکان تھے۔ گھروں کے دروازے کھلے ہوتے تھے۔ خواتین اپنے مخصوص لبادوں میں کاموں میں مگن ہوتی تھیں۔ تب وہاں چکن میسر نہیں تھا، کوکا کولا کی بوتلیں مہنگی اور نایاب تھیں۔ جبکہ اب وہاں سب کچھ میسر تھا اور یہ رونق والا بڑا شہر بن چکا تھا۔ ایگلز نیسٹ کی تعمیر کی کہانی انسانی عزم کے ثبوت کے طور پر مصنف نے اپنے سفرنامے میں شامل کی ہے۔

## حراموش ناقابل فراموش (۲۰۱۶ء)

مستنصر حسین تارڑ کا شمالی علاقہ جات کا یہ آخری سفرنامہ ہے جو انھوں نے ۲۰۱۶ء میں کیا۔ اس میں انھوں نے حراموش کی گمنامی، یہاں کے لوگوں کے نیم وحشی ہونے کے تاثر کی نفی، قدیم و جدید ناران کی جھلک، مناپن میں اپنے پرجوش خیر مقدم، شمال میں موٹر سائیکل پر سیاحت کے بڑھتے رجحان، قدیم محرابی پل نما کوٹھری کی

مذہبی اہمیت، گلگت کو بلتستان سے ملانے والے عالم پل کی اہمیت، حراموشیوں کی سیلاب سے تباہ ہونے والی سڑک کی اپنی مدد آپ کے تحت بحالی، حراموش میں پھلدار درختوں کی کثرت، لوگوں کے گرمجوشی سے ملنے، کتوال گاؤں کی چراگاہ، مقامی لوگوں سے ملاقات، مقامی بیٹھک کا احوال اور خوراک کو سردیوں کے لیے محفوظ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ مستنصر نے حراموشیوں کے تہذیب سے کٹے نیم وحشی ہونے کے تاثر کو جھٹلایا ہے۔ نصف صدی قبل کے ناران کی جھلک دکھاتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ تب وہاں صرف ایک یوتھ ہاسٹل، ایک ریسٹ ہاؤس، گوجروں کے جھونپڑے اور دو تنور تھے۔ جبکہ ۲۰۱۶ء میں آدھی رات کے وقت بھی یہاں ٹریفک کا اژدہام تھا، ہوٹل کھلے تھے۔ یہاں مہنگائی کو انھوں نے سیاحوں کا قتل عام قرار دیا ہے۔ مناپن میں قدیم روایتی پیرہنوں میں ملبوس بچوں نے ان کا استقبال کیا اور استقبالیہ گیت بھی گایا جس کا ترجمہ مصنف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ ہنزہ کے ایک گھر میں قدیم محرابی پل نما کوٹھری کو کمرشلزم کے باوجود جوں کا توں محفوظ رکھنے کی مصنف نے تعریف کی ہے۔ اس میں پرانے وقتوں میں ان کے امام کے مذہبی احکامات تحریری صورت میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔[۳۰] اب سیاحوں کی یلغار سے اہل ہنزہ اپنے گھروں کے دروازے بند رکھنے پر مجبور ہو گئے تھے جو پہلے کھلے ہوتے تھے۔

حراموش روڈ کو سیلاب سے متاثر ہونے کے بعد حراموشی حکومتی مدد کی آس کے بغیر اپنی مدد آپ کے تحت بحال کر رہے تھے۔ ان علاقوں میں موسم گرما اور موسم سرما کی مختلف طرز بود و باش پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے کہ یہ گرمیوں میں اپنے عارضی گرمائی ڈیروں میں اپنے جانوروں کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔[۳۱] جنگلوں میں درختوں کی بے دریغ کٹائی پر انھوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ایک بیٹھک میں مقامی لوگ مصنف سے ملے۔ وہاں کمرے کے وسط میں الاؤ کے گرد مستطیل شکل کا پتھر تھا، اس کے بائیں طرف پرانا سیاہ ہو چکا صندوق تھا جس میں آٹا تھا۔ ایک ستون کے ساتھ ٹہنی پر خشک ساگ کے ہار پروئے گئے تھے تاکہ سردیوں میں جب کھانے کو کچھ میسر نہیں ہوتا انھیں بطور خوراک استعمال کیا جا سکے۔ وہاں کرکٹ گراؤنڈ میں بچے کھیل رہے تھے۔ کرکٹ بیٹ مقامی لکڑی سے گھڑے گئے تھے۔ وکٹیں پودوں کی ٹہنیاں تھیں اور گیند سرخ چیتھڑوں میں لپٹے پتھر تھے۔ مصنف نے ان کے کھیل سے لگاؤ کے جذبے کی تعریف کی ہے۔ ایک چراگاہ میں کچھ جھونپڑوں کے باہر مقامی بچے تھے۔ ایک بچی کے بارے میں مستنصر لکھتے ہیں:

> ''......ان میں ایک میلی کچیلی بمشکل دو چار مہینوں کے بھائی کو ایک پوٹلی میں باندھے اپنی کمر پر ٹکائے ہوئے تھی۔ اس کے پاؤں میں پلاسٹک کی چپل کی گانٹھیں ادھڑی ہوئی تھیں۔''[۳۲]

مستنصر کے سفر ناموں میں احساس کی شدت زیادہ ہے۔ انھوں نے مقامی لوگوں کے مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ مختلف شمالی علاقوں کی باہمی چپقلش کو بھی اجاگر کیا ہے۔ شمال میں بڑھتا ہوا کمرشلزم، مقامی افراد کے توہمات، عادات و اطوار، قدیم روایات، مقامی خوراک، رسم و رواج، مقامی ہیروز کی بے قدری، آثار قدیمہ، فن تعمیر،

مقامی موسیقی، رقص، لوک داستانوں، لوک گیتوں کا تذکرہ ان کے سفرناموں میں موجود ہے۔ مستنصر قدیم معاشرت کا تذکرہ اپنے سفرناموں میں بطور خاص کرتے ہیں۔ تیزی سے بدلتی ثقافتی قدروں کی نشاندہی کے ساتھ کھو جانے والی قدروں پر دکھ کا اظہار ان سفرناموں میں نظر آتا ہے۔ مستنصر مقامی لوگوں کے عزم و حوصلے، اپنی مدد آپ کے جذبے اور کارناموں کے معترف ہیں۔ مشکل جغرافیائی و موسمی میں بھی یہاں کے بچوں کی علم کے لیے لگن کو مستنصر سراہتے ہیں۔ بڑھتی ماحولیاتی آلودگی، درختوں کی بے جا کٹائی اور سیاحوں کے غیر ذمہ دارانہ رویوں، اخلاقی پاسداری کا خیال نہ رکھنے پر تنقید کرتے ہیں۔ بتیس برس کے دورانیے میں بعد کے سفرناموں میں مصنف نے جا بجا اپنے پچھلے سفروں کے دوران ان علاقوں کی ثقافت کی جھلک دکھا کر قدیم و جدید کے تقابل کے ساتھ نئی رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔

رجحان ساز سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کے شمالی پاکستان کے سفرناموں کا مجموعی ثقافتی جائزہ بتاتا ہے کہ انھوں نے ان علاقوں کی مقامی ثقافت کے نقوش جا بجا اپنے سفرناموں میں اجاگر کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے سفرناموں میں ان علاقوں کے تاریخی و جغرافیائی حقائق پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان سفرناموں میں معاشرت کے حوالے سے ان علاقوں کے رہن سہن، خوراک، لباس حسن و زیبائش اور عادات و اخلاق کی جھلک ملتی ہے۔ سماجیات کی ذیل میں ان علاقوں کے پیشوں، دستکاریوں، رسم و رواج، کھیل تفریح اور تعلیم و تربیت کی تفصیل ملتی ہے۔ اس ذیل میں مجموعی طور پر کھیل تفریح کا ذکر باقی مظاہر سیکم ملتا ہے۔ عقائد و ایمانیات کے تحت ان علاقوں کے مذہبی عقائد، مذہبی رسوم اور افکار کی وضاحت ان کے سفرناموں میں نظر آتی ہے۔ فنون لطیفہ کی ذیل میں ان علاقوں کے لوک ادب، شاعری، موسیقی اور رقص کا سرسری احوال ان کے سفرناموں میں ملتا ہے۔ تمدن کے تحت فن تعمیر اور علم و فن کی عکاسی ملتی ہے۔ اس ذیل میں ان علاقوں کے فن تعمیر کا تذکرہ ان سفرناموں میں زیادہ ہے۔ جبکہ لسانیات کے حوالے سے ان سفرناموں میں شمالی علاقہ جات کی زبانوں کے بارے میں کہیں کہیں معلومات ملتی ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کے شمالی پاکستان کے سفرناموں میں مقامی تہذیب و ثقافت کے متعدد پہلوؤں کی بہتر عکاسی ملتی ہے۔

## حواشی:

۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، ہنزہ داستان، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء) ص ۴۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۸

۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، سفر شمال کے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء) ص ۳۸ تا ۳۹

۵۔ ایضاً، ص ۲۱۲

۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، چترال داستان، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۱۴

۷۔ ایضاً، ص ۲۶

۸۔ ایضاً، ص ۳۷

۹۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۰۔ تارڑ، مستنصر حسین، نانگا پربت بلتستان داستان، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء) ص ۴۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۱۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۶۸

۱۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، کے ٹو کہانی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء) ص ۴۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، یاک سرائے، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء) ص ۹۰ تا ۹۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، سنو لیک، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء) ص ۷۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۷۴

۲۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، دیو سائی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۲۹

۲۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، شمشال بے مثال، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء) ص ۶۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۹۱

۲۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، برفیلی بلندیاں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء) ص ۷۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۴۶

۲۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، رتی گلی، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء) ص ۳۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۸۔ تارڑ، مستنصر حسین، راکاپوشی نگر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) ص ۴۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۵۹

۳۰۔ تارڑ، مستنصر حسین، حراموش نا قابل فراموش، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۵۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۹۸

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۸۰

## ماخذ:


۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، برفیلی بلندیاں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، چترال داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، حراموش نا قابل فراموش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء

۴۔ تارڑ، مستنصر حسین، دیو سائی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۵۔ تارڑ، مستنصر حسین، راکاپوشی نگر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء

۶۔ تارڑ، مستنصر حسین، رتی گلی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۷۔ تارڑ، مستنصر حسین، سفر شمال کے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۸۔ تارڑ، مستنصر حسین، سنو لیک، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۹۔ تارڑ، مستنصر حسین، شمشال بے مثال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۱۰۔ تارڑ، مستنصر حسین، کے ٹو کہانی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۱۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، نانگا پربت بلتستان داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۱۲۔ تارڑ، مستنصر حسین، ہنزہ داستان، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۱۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، یاک سرائے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء